ڈاکٹر محمد شفیق
نیویارک

اشفاق حسین اور ان کی شاعری

اشفاق حسین کی شاعری کا جائزہ لینے اور اس کے بعد اُس پر قلم آزمائی کے لیے ان کی دونوں تصانیف ''ہم اجنبی ہیں'' اور ''آشیاں گم کردہ'' کا مطالعہ ضروری ہے۔ احساسات اور جذبات وقت کے تناظر میں تغیر کے ساتھ جو تعلق ہے وہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس خاص کاوش میں آپ کو ماضی میں بھی جھانکنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ ایک ترقی پسند شخص کی ذہنی کاوش میں تعمیری عمل مثبت سوچ کا نتیجہ ہوسکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سے فقط انسانیت کے خوش نما رنگ ہی جھلکتے ہیں۔ انسانیت کی معراج کیا ہے، اس کے تعین کے لیے بحث ختم نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی اور اس بحث کو زندہ رکھنے کا اخذ یہی ہے کہ انسان کی لغزشوں کی نشان دہی ہوتی رہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اشفاق حسین نے ابھی تک شمالی امریکہ میں ادب کی دنیا میں ایک مثبت کردار ادا کیا ہے، اور اُن کی کوششوں کے سر پر کامیابی کا سہرا ہی ناقدین کے اعتراضات کا جواب ہے۔ اشفاق نے اپنی تخلیقی کاوش کے زاویہ کا تعین ابتدا ہی سے اسی وضع میں کیا۔

سمندر چھوڑ آئے، کوہ و دریا چھوڑ آئے ہیں
نئی دنیا کی خاطر ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں
پہن کر ہم لباسِ اجنبیت کس طرف جائیں
کہ ہم اپنا بدن لائے ہیں چہرا چھوڑ آئے ہیں

اشفاق کی شاعری کا مخصوص فوکس ہجرت ہے اور اس کا درد وہی محسوس کر سکتا ہے، جو اس کے اذیتی سفر سے گزرا ہو۔ میں پہلی دفعہ اپنی مرضی اور بغیر سیاسی دباؤ کے اس ملک میں آ کر جس کرب میں

مبتلا ہوا، اُس کا ترجمان صرف میں ہوسکتا ہوں۔ لوٹ کے جانے کے خیال میں کشتی جلانے کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا اور جب لاچارگی کی بیڑیوں میں خود کو جکڑا پاتا تب برصغیر کی تقسیم کے سبب لاکھوں لوگوں کی ہجرت کا دردناک منظر کا خاکہ بھی سامنے آجاتا۔ اور ایک اجنبی علاقے میں بے سروساماں، بھوکے پیاسے اور تھکے ہارے لاکھوں افراد کی ذہنی کیفیات کا اندازہ لگانے کا احساس بھی شدت سے جنم لیتا اور شمالی امریکہ میں پاکستان اور انڈیا سے آئے ہوئے لاکھوں حضرات کے جذبات کا ادب کی زبان کے اظہار میں کسی لمبی چوڑی بحث کا سہارا لیے بغیر Genuine ترجمان اشفاق حسین ہی ہوسکتے ہیں۔ میری دانست میں وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ دراصل ہجرت کے درد سے ذہنی سکون کے حصول کے لیے کرتے ہیں اور اس لیے ان کا لاشعور ہمہ تن اُن کو قلم کی گرفت کی ترغیب دیتا ہے۔ اُن کا یہ کہنا:

ہجرت کا ثمر بھی تو مقدر نہیں اپنا
بے گھر ہوئے ایسے کہ کوئی گھر نہیں اپنا

اس غزل کا ہر مصرع یا شعر اس خاص کیفیت کا ترجمان ہے۔ اس تخلیق کے مزید دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مٹی سے جدائی نے یہ احساس دلایا
ڈوبے ہیں جہاں ہم وہ سمندر نہیں اپنا
غیروں کا کہاں تک کوئی احسان اٹھائے
ٹکرائیں جو سر کو بھی تو پتھر نہیں اپنا

اشفاق حسین کے جذبات کسی بھی آبادکار کے جذبات سے مختلف نہیں، وہ اپنے وطن کے صحرا کو بھی

سرسبز و شاداب دیکھنا چاہتے ہیں اور نئی دنیا کی سرسبز و شاداب سرزمین میں اجنبیت کے احساس سے خود کو ایک عرصے تک علیحدہ نہ کر سکے، لیکن ایک قلم کار ہی اپنے جذبات کو کاغذی پیرہن پہنانے کے ہنر سے لیس ہوتا ہے، تو وہ یہی کہہ سکتے ہیں:

برسیں گے کبھی ٹوٹ کے امید کے بادل
تپتے ہوئے صحرا کبھی شاداب بھی ہوں گے
یہ لوگ کون سے سورج کی بات کرتے ہیں
میں جس زمین پر ہوں اُس پر آسماں بھی نہیں

ہجرت میں کون ہوگا، جس کو جائے پیدائش کے نقشے کی یاد نہ ستاتی ہوگی یا وہ دوست جن کے ساتھ انہوں نے بچپن گزارا وہ یادوں کے سرمایہ کا حصہ نہیں ہوں گے، اور اس توشہ خانے کے سرمایہ میں احساس زیاں کے خدشے کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے:

اُس دہلیز پہ جب کوئی گلدستہ رکھنا
میرے نام کا بھی اک سوکھا پتا رکھنا
ان رستوں پر یادوں کا اک فرش بچھا ہے
دل کی زمیں پر پاؤں ذرا آہستہ رکھنا

اشفاق اجنبیت کے احساس کے آئینے میں نئی ثقافت، نئی تہذیب اور نئے تمدن کا عکس جب دیکھتے ہیں تو اُن کے ذہن میں یہاں کے نظام کا ہلکا سا نقشہ ابھر کے سامنے آتا ہے۔ اس ملک میں چونتیس سال رہنے کے باوجود اپنے مکاں کے حوالے سے لیے ہوئے قرضوں میں جب خود کو سدھار پاتا ہوں تو اشفاق کا یہ قطعہ میری ذہنی کیفیت کا بھرپور ترجمان بن جاتا ہے۔

خوبصورت سہی نوچے ہوئے پر کس کے ہیں
شاخ در شاخ یہ ہجرت کے ثمر کس کے ہیں
شہر کی ساری عمارات ہیں کن لوگوں کی
قرض پر سب نے جو لے رکھے ہیں گھر کس کے ہیں

اشفاق اپنی حالیہ تصنیف ''آشیاں گم کردہ'' میں اجنبیت کے احساس کے ساتھ سمجھوتہ کرتے نظر آرہے ہیں۔اُن کا ایک شعر جو''ہم اجنبی ہیں'' میں درج ہے،ملاحظہ ہو:

میں اپنے شہر کے لوگوں سے کہہ کے آیا ہوں
کبھی جو یاد میں آؤں مجھے دعا دینا

''آشیاں گم کردہ'' کو پڑھنے کے دوران اس شعرک ذہن میں آنے کے پیچھے شاید یہی نفسیات کارفرما ہے کہ جس کسی نے اُن کو دعا دی ہوگی،اُس دعا نے بابِ اثر کو کھلا پایا ہوگا جس سے ان کی ہجرت کے سوز میں کمی آئی، اور ان کے جذبات کے شور نے دھیمے لہجے کا روپ دھارا لیکن انہوں نے جو Exit پایا وہ اُن کے ان اشعار میں نمایاں ہے:

جب سے اپنے گھر کے بام و در سے نکلے ہیں
کیسے کیسے منظر پسِ منظر سے نکلے ہیں
نا مانوس فضاؤں کو اشفاق نہ دو الزام
خوف کے جو بھی رستے ہیں اندر سے نکلے ہیں

اشفاق حسین کو لگتا ہے جہاں کے درد سے مانوس ہو چکے ہیں بلکہ یار اغیار ایک ہی تار میں پروئے اُن کو نظر آرہے ہیں اور شاید اس تاثر سے وقت کے ساتھ ایک مفاہمت کی فضا میں خود کو پاتے ہیں،تو بے

ساختگی میں یوں گویا ہوتے ہیں:

مرے پاؤں کے نیچے بھی زمیں ہے
مجھے ہجرت کا کوئی دکھ نہیں ہے
کبھی نا آشنا تھے سارے رستے
مگر ہر راستہ اب دل نشیں ہے
کبھی ہر شام بے منظر مکاں تھا
مگر ہر شام اب بے حد حسیں ہے
تو کیا میں نقش ماضی بھول بیٹھا
نہیں ایسا نہیں ایسا نہیں ہے
ہوائیں دوست بن جائیں جہاں پر
وہی اشفاق دل کی سرزمیں ہے

اشفاق کی تخلیقات میں ہجر کے صدموں کے ساتھ ساتھ رومانس کے خوشگوار جھونکوں کا امتزاج بھی ہے جو روشن خیالی کی روشنیوں سے جگمگا رہے ہیں، جن سے اُن کے ہر کرب کو وہ خنکی ملتی ہے جس کو اگر سینے سے لگایا جائے تو یہ خنکی پرسکون تاب وتوانائی بخشتی ہے۔ یہیں سے وہ فیض وفراز کے زمانے سے اپنا تخلیقی رشتہ جوڑتے نظر آرہے ہیں، لیکن اپنی تخلیقی کاوش کی پہچان اور مضامین کے انتخاب میں وہ انفرادیت کے رنگ تراشنے کا ہنر جانتے ہیں اور اپنے دیس سے دور اجنبی فضاؤں میں آشیاں کی تعمیر کے تصور میں خود کو جب گم پاتے ہیں تو ایک نا فراموش تخلیق ہی اُس کے صلے میں آسکتی ہے جس کا نام ''آشیاں گم کردہ'' ہے۔